حسینؑ اور قربانی

(مختصر مرثیہ)

وحید الحسن ہاشمی

تعاون

حلقۂ شعرائے اہلبیتؑ پاکستان

حسینؑ اور قربانی

(مختصر مرثیہ)

وحید الحسن ہاشمی

تعاون

حلقہ شعرائے اہلبیت پاکستان لاہور

سال اشاعت ـــــــ ۱۹۷۷ء
تعداد ـــــــ ایک ہزار
مطبع ـــــــ نامی پریس لاہور
کاتب ـــــــ محمد اکرم
تعاون ـــــــ حلقہ شعرائے اہلبیت پاکستان لاہور

ملنے کا پتہ

امامیہ مشن ۱۷/ انارکلی لاہور
معارف اسلام شاہ عالمی لاہور
تنظیم الاسلام ۴/ مزنگ روڈ لاہور

بسمہٗ

پروفیسر محمد اشرف لاہور

انسان کے ساتھ غم اور خوشی دونوں قسم کے جذبات منسلک ہیں خوشی آتی ہے اور چلی جاتی ہے لیکن غم خواہ کسی نوعیت کا ہو آکر واپس نہیں جاتا خصوصیت سے اہل و عیال اور جگر گوشوں کی جدائی دل پر داغ بن کر رہ جاتی ہے جس قدر کوئی عزیز ہو اسی قدر اس کی فرقت روح کو بے چین کرتی ہے کہنے کو تو یہ کہا جاتا ہے کہ زمانہ ہر شے کو محو کر دیتا ہے لیکن دیکھا یہی گیا ہے کہ آل و اولاد کا داغ کسی طرح مٹائے نہیں مٹتا۔

دنیا میں کچھ ہستیاں بھی اتنی پیاری گزری ہیں کہ ان کے غم بھرے حالات انسانوں کے دلوں پر نقش بن کر رہ گئے ہیں۔ جب بھی ان کی یاد آتی ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

دنیا کی کوئی زبان ہو دنیا کا کوئی ادب ہو دنیا کا کوئی لٹریچر ہو اس کی بقا کا راز اسی غم کے پہلو پر ہے گرے اور ملٹن کے مرثیے آج بھی انگریزی ادب کی جان ہیں ہندو ادب میں رامائن کے ان مناظر کو پڑھیے جہاں غم کی کیفیت بیان کی گئی ہے تو خود بخود آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں۔

جن شعرا نے اس راز کو سمجھ لیا آج بھی ان کے کلام میں تاثیر موجود ہے۔ میر تقی میر اور میر انیس اسی وجہ سے اردو کے منتخب شعرا میں شمار ہوتے ہیں کہ ان کی شاعری کا خمیر غم سے تیار ہوا ہے۔

درد و غم جمع کیے کتنے تو دیوان کیا (میر)

مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے (انیس)

میر انیس کو یہ درد اپنے ماحول سے ملا تھا دلی لٹنے کے بعد رہا سہا لکھنؤ بھی لٹ گیا۔ شرفا ذلیل ہو گئے۔ ہاتھی اور پالکی والے نان شبینہ کو محتاج ہو گئے۔ پھر ان کے جواں بیٹے سلیس مرحوم کی موت نے ان کا جگر پاش پاش کر دیا۔ یہ تمام غم مل کر انیس کی ذات میں سمٹ گئے تھے یہی سبب ہے کہ اگرچہ میر کے یہاں بہتر نشتر ملتے ہیں تو میر انیس کے یہاں بہتر ہزار نشتر پائے جاتے ہیں۔

جدید دور میں نجم آفندی اور سید آل رضا اس درد کے وارث ہیں نجم آفندی اور آل رضا دونوں نے اس درد کو فقط دل ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ عقل و ذہن بھی متاثر کر دیے۔ یہ وقت کا تقاضا تھا دونوں شاعروں کو کرب کے ماحول سے سابقہ پڑا دونوں کے سامنے معاشرے اور تہذیب کے دردناک مناظر تھے اس خارجی غم میں ان کے داخلی غم نے تازیانے کا کام کیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور میں یہ دونوں شخصیتیں غم نگار بن گئیں۔ خدا جانے یہ شخصیتیں مرثیے کے لیے تخلیق ہوئی ہیں یا مرثیہ ان کے لیے۔

مرثیہ درحقیقت ریڈیو ٹیلیویژن خلائی جہاز اور ہائیڈروجن بم کا نام نہیں بلکہ اس میں انسانی جذبات اور سیرت و کردار کے نقوش اجاگر کیے

جاتے ہیں مرثیے میں انسان نہیں انسانیت کے کمالات کا تذکرہ ہوتا ہے اس راز کو فقط ذہین شعراء ہی سمجھ سکتے ہیں۔

وحید الحسن ہاشمی فضائے درد کے شاعر ہیں ان کے کلام میں میٹھا میٹھا سادہ اور ہلکی ہلکی سی ٹیس ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ ان کے زیر نظر مرثیے کو پڑھ کر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ موجودہ مرثیہ نگاروں میں جو رچاؤ جو حسن اور جو سلیقہ ان کے یہاں موجود ہے دوسرے شعراء کے یہاں کم ہے درد اور کسک کی مختلف کیفیتیں ہوتی ہیں اکثر شعرا خارجی درد کا اظہار نہایت خوبی سے کرتے ہیں۔ سودا۔ انشا۔ داغ۔ اقبال اس فن کے مشہور شاعر ہیں لیکن دل کی کسک اور قلب کی تڑپ والی شاعری۔ میر تقی میر۔ غالب، میر انیس اور آل رضا کے حصے میں آئی وحید ہاشمی اسی گروہ آخر سے تعلق رکھتے ہیں انسانی دل و دماغ میں جو کیفیت کروٹیں لیتی ہے۔ اس کا اظہار اس خوبی سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اور سننے والا دونوں یہ سمجھتے ہیں۔

میں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ بھی میرے دل میں ہے

ایک اور خصوصیت جو وحید ہاشمی کو دیگر مرثیہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اشاریت ہے یوں تو جستہ جستہ تمام شعرا اشاریت سے کام لیتے ہیں لیکن تلازمے کے ساتھ یہ بات کسی ایک شاعر کے یہاں موجود نہیں ہے

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ رنگ خاص وحید ہاشمی ہی کے ساتھ مختص ہے۔ آپ زیر نظر مرثیہ پڑھ لیں ہر بند بلکہ ہر شعر میں تہ داری نظر آتی ہے یہ تہ داری غالب اور میر والی نہیں ہے بلکہ اس کا دار و مدار کسی گزرے ہوئے واقعے یا گزری ہوئی شخصیت سے ہے۔ مرثیے کی تمہید میں بظاہر آج کا انسان موضوع ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں پانچ ہزار سال کے آدمی کا عکس بھی نظر آتا ہے یہ چیز فن کے نقطہ نظر سے کافی مشکل تھی لیکن انہوں نے اس خوبی اور اس چابکدستی سے بیان کر دیا ہے گویا کوئی بات ہی نہیں ہیں نہیں کہہ سکتا کہ آگے چل کر یہ انداز کیا رنگ اختیار کرے گا سر دست ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

فلسفۂ قربانی ایک عظیم فلسفہ ہے لیکن شاعر نے غالباً اختصار کے پیش نظر مسئلے کے تمام پہلوؤں پر روشنی نہ ڈالی حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے مرثیے کو فلسفے کی موشگافیوں سے بوجھل نہیں کرنا چاہتے تھے اس وقت جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ ایک ادبی شاہکار ہے جس کی ہر فنکار داد دے گا۔

محمد اشرف لاہور
یکم ستمبر ۷۵ء

مرثیہ

وہم و گماں کے دشت میں حیراں ہے آدمی
اک مستقل خیال پریشاں ہے آدمی!
خود اپنی زندگی سے گریزاں ہے آدمی
ہر دم شکارِ گردشِ دوراں ہے آدمی

دوشِ نظر سے چادرِ غیرت اتار کے
دنیا لیے ہے دین کی توفیق ہار کے!

خنجر ہے آدمی کے لیے آدمی کی بات!
خود رفتگی کے زہر سے مضطر ہے کائنات
کم ظرف چھینتا ہے گلوں سے زرِ حیات
نقد حواس پر ہے خریدارِ شبہات

بگڑی ہوئی ہے بات خدا جانے کیا بنے
اب آدمی کو فکر یہی ہے خدا بنے

یہ فکر ہے جہاں کے لیے دردِ مستقل
یہ فکر ہے خلافِ تقاضائے آب و گل
یہ فکر ہے نگاہ کی دشمن رقیب دل
انسانیت ہے آج اسی فکر سے خجل

قدرت شعور پر نہ بھروسہ شعار پر
لب پر خدا ہے نظر اقتدار پر

رہزن کی اب یہ ضد ہے کہ رہبر کہیں اُسے
مُفلس یہ چاہتا ہے تونگر کہیں اُسے
قطرے کی آرزو ہے سمندر کہیں اُسے
جاہل مصر ہے نفس پیمبر کہیں اُسے

حکم امام اسکی نظر میں عناد ہے!
اپنی روش غلط ہو تو وہ اجتہاد ہے

کیا کیا فریب آپ سے کرتا ہے آدمی
جینے کے اشتیاق میں مرتا ہے آدمی
خود ساز گمرہی سے گزرتا ہے آدمی
تسکین دیں رسول تو ڈرتا ہے آدمی

اس کی نظر میں حق کا قرینہ کوئی نہیں
دشتِ عرب ہے دل میں مدینہ کوئی نہیں

کتنا حریص منصب دنیا ہے آدمی!
غارت گری کی جھیل میں ڈوبا ہے آدمی
جاگا اگر تو خواب میں جاگا ہے آدمی
سلجھے ہوئے نظام سے الجھا ہے آدمی

الزام رکھ رہا ہے خرد کی اساس پر
حق پر اسے گماں ہے یقیں ہے قیاس پر

مانندِ روز و شب ہے بیان و عمل میں فرق
غربت کی گفتگو ہے تو پوشاک زرق برق!
درسِ خودی زمانے کو خود بے خودی میں غرق
خواہش یہ ہے کہ زیرِ اطاعت ہوں غرب و شرق

اتنی ہوس کہ ذہن کا محور بھی چھین لے
بس میں نہیں ہے ورنہ مقدر بھی چھین لے

اب بھی رہ نفاق پہ چلتا ہے آدمی!
اب بھی گناہ کرکے مچلتا ہے آدمی
اب بھی نفس کی آگ میں جلتا ہے آدمی
اب بھی قدم قدم پہ بدلتا ہے آدمی

دُھندلا ہے دل کا آئینہ دنیا کی دھول سے
اب بھی گلاب پست ہے کاغذ کے پھول سے

ہر ذات اپنی ذات سے رسوا ہے اندنوں
عقبیٰ کے رُخ پہ غازۂ دنیا ہے اندنوں
سستا بہت ضمیر کا سودا ہے اندنوں
غیرت کسی غریب کا لاشا ہے اندنوں

کتنا حسیں فریب نظر کھا رہے ہیں لوگ !
دو کشتیوں میں پاؤں ہیں اِترا رہے ہیں لوگ

ڈوبا ہوا ہے بحرانا میں مزاجِ دہر!
اُٹھتی نہیں ہو میں خلوص و وفا کی لہر
جاری ہے دشتِ ذہن میں خود غرضیوں کی نہر
پیتا ہے آج آدمی اپنے بدن کا زہر!

ایثارِ جسم و جان کی کوئی گفتگو نہیں
اب کائناتِ دل میں فقط مَن سے تو نہیں

مومن کو یہ طریق رعونت ہے ناگوار
مومن قبائے فخر کو کرتا ہے تار تار
نخلِ وفا کو دے کے مقدّس لہو کی دھار
مومن خریدتا ہے خدا سے خدا کا پیار

وہ چاہتا ہے مرضیٔ حق پر نظر رہے
کٹ جائیں جواں پسر رہے حق مگر رہے

تسکین آرزو کا بھرم ہے جواں پسر
باقی ہے یہ بھرم تو جواں ہے دل پدر
ہر سخت مرحلے پہ غرض مند ہے بشر
دل کی کشش جدھر ہو نظر کا سفر ادھر

لیکن وہی خلیل ہے وحدت کی راہ میں
لائے جو اپنے لال کو خود قتل گاہ میں

قربانیِ پسر سے نکھرتا ہے آدمی!
قربانیِ پسر میں ہے منشائے ایزدی

لاریب یہ نماز ہے تقدیرِ بندگی
قربانیِ پسر ہے ادائے پیمبری

حق سے فضیلتوں پہ فضیلت عطا ہوئی
اس کے سبب نبی کو امامت عطا ہوئی

کتنا نظر فروز ہے یہ جذبۂ حسین!
یہ کیفیت ہے عشق کی صہبائے انگبیں
انسان ہے اسی کی بدولت فلک نشیں!
اس کے طفیل عرش سے بالا ہوئی زمیں

حق ان کے ساتھ ہے جو مٹے ہیں برائے حق
ٹھہری ہے ایک نفس کی قیمت رضائے حق

لیکن بشر کو اپنے سوا کچھ خبر نہیں
اس طرح جی رہا ہے کہ جیسے بشر نہیں
اہلِ نظر کے اشکِ رواں پر نظر نہیں
غربت زدوں کی بات کوئی معتبر نہیں

نظریں ہر ایک قلبِ پریشاں سے موڑ کے
تصویر دیکھتا ہے یہ آئینہ توڑ کے

یہ کیا کہ حسن سرو و سمن اپنے واسطے
غیروں کو دشتِ خار چمن اپنے واسطے
دنیا کو دکھ سکونِ بدن اپنے واسطے
پردیس دوسروں کو وطن اپنے واسطے!

زندہ معاشرے میں اسیرِ مرض کہو!
ایسے بشر کو کچھ نہ کہو خود غرض کہو!

یہ کیا کہ ہر خیال کا محور ہو اپنی ذات
یہ کیا کہ ہر نگاہ کا منظر ہو اپنی ذات
یہ کیا کہ ہر خلوص کا جوہر ہو اپنی ذات
یہ کیا کہ ہر بشر کا مقدر ہو اپنی ذات

جو زندگی میں نفس کی خواہش سے دور ہے
وہ آدمی امام ہے وحدت کا نور ہے

قربانیوں سے حوصلہ زندگی بڑھا
قربانیوں سے سلسلۂ آگہی بڑھا!
قربانیوں سے مرتبہ عاشقی بڑھا
قربانیوں سے دبدبۂ آدمی بڑھا

لا علم تھے ملک ہدفِ بے بسی بنے
پچھتا رہے ہیں ہم بھی نہ کیوں آدمی بنے

قربانگہِ حیات میں رکھتے ہیں جو قدم
ان کی نظر بہشت ہے ان کی نظر ارم
رکھتے ہیں اپنے دل میں جو خلق خدا کا غم
سائل تو کیا سوال کا رکھتے ہیں وہ بھرم

سب کچھ وہ جان لیتے ہیں چہرے کے حال سے
سائل کو بخش دیتے ہیں پہلے سوال سے

قربانیوں کو ان کے لہو سے بقا ملی

دستِ طلب کو شوخیِ رنگِ حنا ملی

ایثار کے وجود کو روحِ عطا ملی

کعبے کے قلب کو نظرِ کربلا ملی

پھیلی فروغِ بزم کی ضو رزمگاہ میں

یہ دل سجا گئے ہیں شہادت کی راہ میں

بیداریٔ عمل کا جو گھٹنے لگا وقار
ہمدردیٔ نظر کا جو لٹنے لگا سنگار!
چلنے لگی جو حق کے گلے پر چھری کی دھار!
اہل فساد کہنے لگے صبر کو فرار

کی سرکشی جو حرص و ہوس کے کمیت نے!
قربانیوں کو پیار کیا اہلبیت نے

قربانیوں کا حُسنِ مجسّم ہیں اہلبیت
عظمت ہے زندگی تو مُعظّم ہیں اہلبیت!
قربانیاں کرم ہیں مکرم ہیں اہلبیت
دُنیا اگر ہے زخم تو مرہم ہیں اہلبیت!

ان کے عمل سے گلشنِ ہستی میں رنگ ہے
ان کے بغیر صلح ہے کوئی نہ جنگ ہے

انسانیت کی پیاس بجھاتے ہیں اہلبیت !
اُجڑے ہوئے دلوں کو بساتے ہیں اہلبیت
پہلو میں غم، دل کو بٹھاتے ہیں اہلبیت
آنسو رکیں تو خون بہاتے ہیں اہلبیت

تالیف دل میں شب سے سحر ہو گئی انھیں !
آنسو بہے کسی کے خبر ہو گئی انھیں

دنیا سے اپنا درد چھپاتے ہیں اہلبیت
زخموں کے پھول تن پہ سجاتے ہیں اہلبیت
تاریکیوں میں راہ دکھاتے ہیں اہلبیت!
قندیل حق ہوئے جلاتے ہیں اہلبیت

حق کی طرف سے شاہد مطلق ہیں دین پر
ساکن یہ عرش کے ہیں بسے ہیں زمین پر

قربانیِ حیات کو اب ڈر نہیں رہا
دشمنوں کو خوفِ ناوک و خنجر نہیں رہا
عزمِ خلیل رہ گیا آذر نہیں رہا
آئینہ حق ہے دین سکندر نہیں رہا

ایثار کی کماں کو نئے تیر مل گئے
قربانیاں ادا اسی تھیں شبیر مل گئے

شبیرؑ کے حصار میں قربانیاں بڑھیں
سامان لیکے بے سر و سامانیاں بڑھیں!
حد سے سوا جو کذب کی جولانیاں بڑھیں
تردید ظلم و جور کو سیدانیاں بڑھیں

اہرام کفر و شرک کی بنیاد ہل گئی!
قربانی حیات کو معراج، مل گئی!

قانونِ زندگی کو حسینی نظر ملی
مجروح فکر کو نگہِ چارہ گر ملی
غیرت کو حق پسندی دردِ جگر ملی
رہرو کو کربلا کی رہِ معتبر ملی

اٹھی قضا حیات کا ساغر پیے ہوئے
قربانیاں سمٹ گئیں مقتل لئے ہوئے

ہمّت کسی میں ہو تو یہ انداز روک لے
انجام کی خبر دمِ آغاز روک لے!
دم ہے تو جبرئیل کی پرواز روک لے
ہاں اب کوئی حسین کی آواز روک لے

لشکر کا زعم لے کے اگر آئے گا یزید!
اصغر کے لب ہلیں گے تو مر جائے گا یزید!

گزرے جہاں میں یوں تو شہیدانِ نیک نام
اصغر پہ ختم ہو گئیں قربانیاں تمام
وہ بیکسی کی دھوپ وہ تنہائی امام
اک باپ ہے جو فوج عدو سے ہے ہم کلام

سچائیوں کو عزم کا محور کیے ہوئے
قرآں کی شکل ہے علی اصغر لیے ہوئے

پانی کا نام لے تو حمیت کے ہے خلاف
کچھ مانگنا غیور طبیعت کے ہے خلاف؟
پیچھے قدم ہٹیں یہ شجاعت کے ہے خلاف
آواز دیں رباب کو غیرت کے ہے خلاف

اپنی مثال منزلِ غیرت یہ آپ ہے!
بیٹا سمجھ رہا ہے کہ مجبور باپ ہے!!

یہ فکر تھی مدد میں تغافل کوئی نہ ہو
معیار صبر و ضبط میں کوئی کمی نہ ہو
نام علی کی دہر میں بے حرمتی ۔ نہ ہو
در پر کھڑی رباب کہیں دیکھتی نہ ہو

قرآن کو حسین نے کعبہ بنا دیا !
بچے کو کربلا کی زمیں پر لٹا دیا !

وہ گرم گرم ریت وہ جانِ دلِ رباب
صحرا میں دھوپ دھوپ کے صحرا میں اک گلاب
ننھا دیدنی زمیں کے مقدر کا آفتاب
پوتا بنا ہوا تھا علی کا ابوتراب!

کیا کیا گزر رہی تھی دلِ ما وطین پر
ڈر تھا کہ آفتاب نہ اترے زمین پر

شبیرؑ کی پسر کے ارادوں پہ تھی نظر
تنہا تھے امتحانِ وفا کے محاذ پر!
ہموار کر رہے تھے شہادت کی رہگذر!
کمسن پسر کا تول رہے تھے دل و جگر

دنیا کو رنگِ عدل میں حیران کر دیا
اصغرؑ کو اور دین کو میزان کر دیا
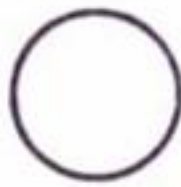
یہ کچھ سوچ کر پسر کو اٹھایا حسینؑ نے
قرآن کو گلے سے لگایا حسینؑ نے
اصغر کی آستیں کو چڑھایا حسینؑ نے
بچے کو شہ سوار بنایا حسینؑ نے

یہ فکر سب کہیں کہ قیامت کا ڈھنگ ہے
اصغر کی یہ دغا نہیں اکبر کی جنگ ہے

اصغر پدر کی صدق بیانی سمجھ گئے
الفاظِ بے صدا کے معانی سمجھ گئے!
پیتے ہیں کیسے تیغ کا پانی سمجھ گئے!
لائے ہیں کیوں حسین، کہانی سمجھ گئے

شیرِ خدا کے زور کا منظر دکھا دیا
خیبر رگِ گلو پہ اٹھا کر دکھا دیا!

تیرِ اجل سے جذبۂ اصغر نہ چھُپ سکا
رنگِ مزاجِ سوز کو ہرشہ نہ چھُپ سکا!
گرد خزاں سے حسنِ گلِ تر نہ چھُپ سکا!
ہارا یزید مقصدِ سرور نہ چھپ سکا!

ناوک چلا جو دشت میں کمسن شہید پر
جاکر لگا دمشق میں قلبِ یزید پر!

معصوم کے گلے سے اٹھی وہ لہو کی دھار
سہمی اجل الٹ گیا میدانِ کارزار ؟
دستِ پدر پہ فاتحِ احساس شیر خوار
پروردگار صبر کی قوّت بروئے کار ؟

خاموشیوں میں حاصل گفتار مل گیا
اصغر ہنسے تو شام کا دربار ہل گیا

دستِ قضا نے کھول دیں بچے کی مٹھیاں
گویا جہاں میں کھل گئے اسلام کے نشاں
ہر اہلِ دل سے کہہ گئیں معصوم ہچکیاں!
اب مقصدِ حیات ہے آوازِ بے زباں

رنگِ بہار خونِ گلِ تر کا نام ہے!
دینِ خدا شہادتِ اصغر کا نام ہے!

زندہ ہے آسماں کی نظر میں یہ انقلاب
زہرا کا آفتاب ہے اور سرخ ماہتاب
احساس اک سوال ہے احساس اک جواب
ننھی سی ایک لاش ہے یا درد کی کتاب!

انسانیت کی فتح کا عنواں ہے سامنے
اصغر نہیں ہیں صبر کا قرآں ہے سامنے
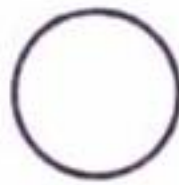
چہرے پہ اپنے لال کا خوں اور جگر میں درد

شبیر چھپ کھڑے ہوئے بھرتے ہیں آہ سرد

زخموں کو پیار کرنے لگی کربلا کی گرد!

دیکھا جو اپنے چاند کے رخسار زرد زرد!

یک خیال قافلہ دل میں آگیا

صبر حسین اشک کی منزل میں آگیا

آنسو گرے تو ہل گئی بنیادِ کائنات !
گلہائے صبر دیکھ کے رونے لگی حیات
ساحل کے ساتھ سر کو ٹپکنے لگی فرات
دشتِ بلا نے خاک اڑا کر کہی یہ بات !

سبطِ رسول خیمے میں جائیں گے کس طرح
بچے کی لاش ماں کو دکھائیں گے کس طرح

شبیرؑ نے نگاہ جو کی کائنات پر
دیکھا رُخِ رسول ہے تازہ لہو میں تر
زہرا سنبھالتی ہیں کبھی دل کبھی جگر
لیکن ابھی رباب کی جھولے پہ ہے نظر

واقف ذرا نہیں ہیں مقدر کے پھیر سے
گھبرا رہی ہیں گود جو خالی ہے دیر سے

منصف مزاج ہے تو بنائے کوئی بشر
اب کیا کہیں رباب سے سلطانِ بحر و بر
بچّے کے انتظار میں ماں ہے قریبِ در
کس طرح لے کے جائیں وہاں میتِ پسر

کس دل سے اب یہ جا کے بتائیں رباب کو
اک سنگدل نے توڑ لیا ہے گلاب کو!

ٹوٹے ہوئے گلاب پہ قربان ہے نگاہ
پلکوں پہ آنسوؤں کی جگہ خونِ بے گناہ
ماحول میں گھلا ہوا طوفانِ درد و آہ
مظلومیٔ حسین ہے اور آخری گواہ!

اک مسئلہ ہے دشت میں لختِ جگر کی قبر
ماں سامنے ہے کیسے بنائیں پسر کی قبر
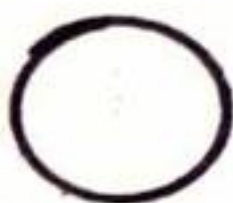
میّت لیے ہوئے جو بڑھے جانبِ خیام
دل نے بہ اقتضائے مشیّت کیا کلام
مقتل میں ایک نشب ہے اس چاند کا مقام
سوئے گا تھوڑی دیر وہیں اب یہ لالہ فام

مسکن دہکتی ریت ہے اس ماہتاب کا
دفنائیے زمیں میں کلیجہ رباب کا؟

مظلوم نے لحد جو بنائی تو ایک بار
کہنے لگے زمین سے اشک رواں کیے نثار
اے کربلا غریب کی دولت سے ہوشیار
جھولے سے تیری گود میں آیا ہے شیر خوار

ابن علی کو پیار ہے اس نورِ عین سے
رکھنا ابو تراب کے پوتے کو چین سے

رکھا لحد کی چھاؤں میں جب اپنا نورِ عین
صحرا کی نذر ہو گیا اک ماں کے دل کا چین
اس واقعے پہ کانپ گئی روحِ مشرقین!
ہموار کر کے قبر کو کہنے لگے حسینؑ!

بیچین کیوں ہو نیزے پہ معراج پاؤ گے
اصغر تم اپنے باپ کے ہمراہ جاؤ گے!

تلوار نے کہا مری آنکھوں میں ہے لہو
آل رسول قتل ہو زندہ رہیں عدو
حیدر کا لال خونِ پسر سے کرے وضو
یہ گرم ریت اور یہ اصغر سا ماہ رو!

یا بوتراب دیر ہے کیوں انتقام میں
ماں گھر میں بے قرار میں بے کل نیام میں

خالی ہوئے جو ہاتھ، اٹھے سیّدالانام
کچھ سوچ کر اٹھائے قدم جانبِ خیام
آئے قریبِ در تو کیا اس طرح کلام
سیراب ہو گیا مرا معصوم تشنہ کام!
چین آیا اے رباب مہِ نصف سال کو
جھولا جھلا رہی ہے زمیں تیرے لال کو

اب درد و غم کی آخری منزل ہے آرباب
اصغر کا خون صبر کا حاصل ہے اے رباب
مقتل میں اب حیات کا ساحل ہے آرباب
اب خنجر دل میں فاطمہ کا دل ہے آرباب

کچھ دیر بعد خاک میں تیرا سہاگ ہے!
شبیر کی نگاہ میں خیموں کی آگ ہے!

(تمام شُد)

یہ مرثیہ ۲۸ جنوری ۴۴ء کو ۴ بجے دن رضویہ امام باڑہ کراچی میں پڑھا گیا۔

وحید الحسن ہاشمی